حدیث کے متعلق چند سوالات

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"منکرین حدیث کے جواب میں آپکا فاضلانہ مضمون مندرجۂ ترجمان القرآن پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ اسی سلسلہ میں اگر جناب ذیل کے امور پر مزید روشنی ڈالیں تو ذی علم احباب کے لئے عموماً اور ناظرین رسالہ کے لئے خصوصاً بہت ہی مفید ہوگا۔

(۱) حفاظت قرآن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر کہ لاتکتبوا عنی سوی القرآن ایک ضروری احتیاط کی صورت پیدا کردی تھی۔ صحابہ کرام قرأتؓ حفظ قرآن کما نزل کے لئے مامور تھے اور اسی پر عامل رہے باوجود اس کے اختلاف قرآت پیدا ہوا جس کا دفعیہ بعہد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ احادیث بمقابلہ قرآن ویسی محفوظ و ثبوت نہیں ہوسکتیں خصوصاً جبکہ فتن جمل وصفین کے بعد مدت تک ان کی جمع و تنقید کی مختلف ذرائع سے کوشش کی گئی، جبکہ طرق، رواۃ اور موضوعات کی چھان بین بہت مشکل تھی۔

(۲) احادیث فعلی اور قولی میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ مثلاً احادیث فعلی میں سے کیفیت و ہیئت نماز کے متعلق عقل چاہتی ہے کہ مطلقاً کسی قسم کا اختلاف نہ ہو خصوصاً جب کہ ارشاد نبوی تھا کہ صلوا کما رأیتمونی

اَصَلِّی کم از کم حرمین شریفین میں دن رات میں پانچ مرتبہ ایک گروہ کثیر ہر زمانہ میں متواتر اس عمل کو مشاہدہ کرتا رہا۔ مگر ابتدائے زمانہ ہی میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف جو بصورت رفع یدین۔ ارسال یدین۔ وضع یدین۔ تامین بالجہر وغیرہا ظاہر ہوا اس تواتر فعلی کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے اور تواتر قولی کی حیثیت اور بھی گر جاتی ہے خبر آحاد کا کیا کہنا۔

(۳) اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیوٰۃ طیبہ ہمارے لئے عملی طور پر سبق آموز ہے۔ قرون اولی میں جبتک کہ جمع احادیث کا تسلی بخش اہتمام نہ ہو سکا، تو یقین عظیم کے باہر مسلمان قرآن مجید ہی سے اسوۂ نبوی کا اقتباس کرتے تھے اخلاق رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا اور آپ نے جواباً فرمایا کان خلقہ القرآن غرض قرآن پاک سے اسلامی اخلاق اور زندگی کے معلوم کرنے کے لئے ذخیرہ وافر ہے۔ فی زمانہ بھی بہت تھوڑے ہیں جن کو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی سوانح بالتفصیل والصواب معلوم ہوں مگر متبعین شریعت عموماً اصول و ارکان اسلام سے واقف ہیں اور یہی مقصود بالذات تھا مذکورہ بالا بعض منکرین حجیت حدیث کے شبہات ہیں جن کا ازالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ورنہ خاکسار مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا کو صحیح معنوں میں مانے کر حجیت حدیث صحیح کا قائل ہے۔

ترجمان القرآن :- آپ نے جن اعتراضات کی طرف توجہ دلائی ہے، ان کے علاوہ بیسوں اور اعتراضات بھی ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے پیش کئے جاتے ہیں مگر ان جزئی باتوں پر جدا جدا بحث کرنا طول کلام کا موجب ہے، اور غیر ضروری بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی رائے کا تمام تر انحصار اس کے

نقطۂ نظر پر ہے۔ جب کسی مسئلہ پر وہ مخالف نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو تمام مخالف ہی مخالف دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب موافق نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو تمام دلائل موافقت ہی میں نظر آتے ہیں۔ مگر جب خالی الذہن ہو کر تلاش حق کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو موافق اور مخالف دونوں قسم کے دلائل پر اس کی نظر پڑتی ہے، اور دونوں میں موازنہ کر کے وہ ایک معتدل رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اعدائے اسلام کے حملوں سے متاثر یا غیر محتاط علماء کی روایات سے برداشتہ خاطر ہو کر احادیث سے بدظن ہو چکے ہیں، وہ جب ایک مخالف نقطہ سے احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو حدیثوں کے ناقابل اعتماد اور ناقابل احتجاج ہونے کے لئے دلائل پر دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو لوگ قدامت پسندی کے ماحول میں پرورش پائے ہوئے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ ہر حدیث کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو بے چون و چرا مان لیتے ہیں، خواہ ضعیف بلکہ موضوع ہی کیوں نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں، اور جب نقطۂ نظر غلط ہیں تو جو کچھ ان نقطوں سے دیکھا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ تمام احادیث کو مطلقاً غلط سمجھنے والے بھی غلطی پر ہیں، اور تمام احادیث کو مطلقاً صحیح کہنے والے بھی۔ یہ لوگ بھی راہ راست سے ہٹ گئے ہیں جو احادیث اور قرآن مجید میں فرق نہیں کرتے اور وہ لوگ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں جو احادیث کو قطعاً ناقابل احتجاج قرار دیتے ہیں۔ صحیح راستہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ اور وہ درمیانی راستہ نظر نہیں آسکتا جب تک کہ دیکھنے والا ان متضاد نقطوں سے ہٹ کر وسط کے نقطہ پر نہ آجائے۔ پس اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جزئیات میں الجھنے کے بجائے انتہا پسندوں کے نقطۂ نظر پر براہ راست حملہ کیا جائے اور ان کو وہاں سے ہٹا کر صحیح نقطۂ نظر پر کھینچ لایا جائے۔

تاہم جب آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بیان کردہ امور پر روشنی ڈالی جائے، تو مختصراً میں ان پر اظہار رائے کئے دیتا ہوں۔

(۱) یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ احادیث اس حد تک محفوظ نہیں ہیں جس حد تک قرآن مجید ہے، مگر یہ خیال

صحیح نہیں ہے کہ وہ مطلقاً محفوظ ہی نہیں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول اور عمل ہم تک صحت کے ساتھ پہنچا ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روایات کے طریقوں اور راویوں کے احوال کی چھان بین میں بہت دقتیں پیش آئی ہیں، اور ان میں محدثین کے درمیان اختلافات بھی ہوئے ہیں۔ مگر فن حدیث کی تاریخ شاہد ہے کہ محدثین نے تحقیق و تفتیش کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، اور اس کام میں اتنی محنتیں کی ہیں کہ ان سے زیادہ انسان کے بس میں نہیں۔ انہوں نے اپنی ان محنتوں سے جو ذخیرہ فراہم کیا ہے، وہ آج ہمارے پاس موجود ہے، اور ان کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں، وہ بھی تمام دلائل و شواہد کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر کوئی اس ذخیرہ پر تحقیق کی نظر ڈالے تو اس کے لئے آج تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا اور کیا نہیں فرمایا۔ کیا کیا اور کیا نہیں کیا، اور یہ کہ ہر روایت جو آپ کی طرف منسوب ہے وہ اپنی صحت اور اپنے قابل احتجاج ہونے کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتی ہے؟ لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے۔ اس لئے صحت کا اصلی معیار قرآن ہی ہونا چاہئے۔ جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے مخالف ہوگی اسے ہم یقیناً رد کر دیں گے، اور اس کا مخالف قرآن ہونا ہی اس امر کا بین ثبوت ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چیز ہرگز ثابت نہیں ہے۔ اور جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے موافق ہوگی، اور تعلیمات قرآن کی ایسی تشریح و توضیح یا احکام کی ایسی تفصیل ہوگی جو قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے خلاف نہ ہو، اور روایت و درایت کے طریقوں سے اس کے معتبر ہونے کا ظن غالب بھی حاصل ہو جائے گا اس کو ہم ضرور تسلیم کریں گے، اور اپنی عقلی تفسیر و تشریح اور اپنی رائے پر اس کو ترجیح دیں گے۔

(۲)۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں، اور ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہئے لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ

سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو، یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو، اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق بھی نہیں ہوسکتے کہ ان کے درمیان یک سر مو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اُس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا، مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائیگا، اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر میں آج ایک تقریر کرتا ہوں۔ ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں، اور جا کر لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ہر شخص اس کو لفظ بلفظ نقل کردے۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کریگا، کوئی کسی دوسرے ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کریگا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کردے گا۔ اب اگر کوئی شخص اس اختلاف کو دیکھ کر یہ کہدے کہ میں نے سرے سے کوئی تقریر ہی نہیں کی، یا جو تقریر کی تھی وہ از سرتا پا غلط نقل کی گئی تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر اس تقریر کے متعلق تمام اخبارِ آحاد کو جمع کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس امر میں سب کے درمیان اتفاق ہے کہ میں نے تقریر کی، فلاں جگہ کی، فلاں وقت کی، بہت سے آدمی جمع تھے، اور تقریر کا موضوع یہ تھا۔ پھر تقریر کے جن جن حصوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ اتفاق، لفظاً یا معنًی پایا جائیگا۔ وہ زیادہ مستند سمجھے جائیں گے اور ان سب کو ملا کر تقریر کا ایک مستند مجموعہ مرتب کرلیا جائے گا اور جن حصوں کے بیان کرنے میں ہر راوی منفرد ہوگا وہ نسبتہً کم معتبر ہونگے۔ مگر ان کو غلط اور موضوع کہنا جائز نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ تقریر کی پوری اسپرٹ کے خلاف نہ ہوں، یا کوئی اور ایسی بات ان میں نہ ہو جس کی وجہ سے ان کی صحت مشتبہ ہو جائے۔

یہی حال احادیث فعلی کا بھی ہے۔ آپ نے نماز کی مثال پیش فرمائی ہے میں بھی اسی مثال کو سامنے رکھ کر جواب عرض کرتا ہوں۔ نماز کے متعلق تواتر قولی و عملی سے یہ بات متفقہ طور پر ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقت کی نماز فرض ادا فرماتے تھے، نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی

مقتدی آپ کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہوتے اور آپ کی حرکات و سکنات کی پیروی کرتے تھے۔ آپ قبلہ کی جانب رخ فرمایا کرتے۔ تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز میں داخل ہوتے، قیام، رکوع، سجود، اور قعود سے نماز مرکب ہوتی تھی۔ ہر رکن نماز کی فلاں فلاں ہیئتیں تھیں۔ غرض نماز کے جتنے اہم اجزاء ترکیبی ہیں ان سب میں تمام زبانی روایات متفق ہیں اور عہد رسالت سے آج تک ان کے مطابق عمل بھی ہو رہا ہے۔

اب رہے جزئیات مثلاً رفع یدین و ارسال یدین، و وضع یدین وغیرہ تو ان کا اختلاف اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں حضور صلی اللہ علیہ سلم کا عمل مختلف دیکھا ہوگا۔ چونکہ یہ امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، اور ان میں سے کسی کے کرنے یا نہ کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اور حضورؐ خود صاحب شریعت تھے، اس لئے آپ جس وقت جیسا چاہتے عمل فرماتے تھے، لیکن حضور کے سوا کوئی اور شخص صاحب شریعت نہیں ہے، اور اس کا کام اتباع ہے نہ کہ تشریع، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ آپ کا زیادہ سے زیادہ صحیح اتباع کرنے کی کوشش کریں، اور احادیث کا تتبع کرکے معلوم کریں کہ ہر جزئیہ کے متعلق زیادہ صحیح اور مستند روایات کونسی ہیں۔

اس باب میں اختلاف رائے ممکن ہے، اور ہوا بھی ہے۔ کسی نے کسی روایت کو زیادہ مستند سمجھا اور کسی کو اس کے خلاف روایت پر اطمینان حاصل ہوا۔ مگر یہ اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور یہ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ ادائے نماز کے متعلق سرے سے کوئی قولی و فعلی تواتر ہی نہیں پایا جاتا۔

(۳) قرآن پاک اور حدیث نبوی کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے سے تیسرا سوال پیدا ہوا ہے قرآن پاک میں سب سے زیادہ زور ایمان پر دیا گیا ہے، اور ایمان ہی کی تفصیلات سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ اس کے لئے تو ہمیں قرآن سے باہر جانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، اور حدیث میں اس سے زیادہ کوئی چیز ملتی بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد اخلاقی تعلیمات ہیں، قرآن میں اصول اخلاق قریب قریب سب کے

بیان کر دیے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اخلاق کا تعلق لفظی بیان سے اتنا نہیں ہے جتنا عملی نمونہ سے ہے۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اخلاق کا مجسم نمونہ بنا کر پیش فرمایا۔ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور اپنے مواعظ، اور اپنی تعلیم حکمت اور عملی تربیت (تزکیۂ نفوس) سے ان تمام اصول اخلاق کی قولی و عملی تشریح فرما دی جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں پس جو شخص اس اسوۂ نبوی کو چھوڑ کر کہتا ہے کہ اس باب میں ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہے وہ اپنے آپ کو بہت بڑی نعمت سے محروم کرتا ہے،، بلکہ درحقیقت وہ حق تعالیٰ کے اس فعل کو عبث سمجھتا ہے کہ اس نے تنزیل کتاب کے ساتھ رسول بھی مبعوث فرمایا، اور یہ کہکر مبعوث فرمایا کہ ہمارا رسول نہ صرف تم کو ہماری آیات سنائیگا۔ بلکہ تمہارا تزکیۂ نفس بھی کریگا۔ اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دیگا۔ اور اس کی زندگی میں تمہارے لئے اسوہ حسنہ بھی ہوگا۔

اب رہ گئے احکام تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں، اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا۔ اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں، ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضورؐ سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں، مثلاً عہد نبوی کے قوانین مدنی۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق ویسی ہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ پورا اور پکا مسلمان بننے کے لئے قرآن مجید کے ساتھ حدیث کا علم کس قدر ضروری ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ایک عام مسلمان حدیث کے علم کے بغیر ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہے، تو میں کہونگا کہ یہ علم حدیث کی ضرورت نہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اگر یہ دلیل ہے تو یہی دلیل قرآن کے علم کی ضرورت نہونے پر بھی قائم کی جا سکتی ہے کیونکہ ایک عامی مسلمان قرآن کے علم سے بھی بہت کم بہرہ ور ہوتا ہے اور پھر بھی اپنی زندگی میں احکام شریعت کا اتباع کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہد نبوی میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد کبھی ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ معیاری مسلمان تو دراصل اس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب بھی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہوں، اور جن کی رگ و پے میں قرآن کا علم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا نمونہ سرایت کر گیا ہو۔ باقی رہے عوام تو وہ اس وقت بھی ان معیاری مسلمانوں کے پیرو تھے، اور آج بھی ہیں۔ عہد نبوی میں جن صحابہ نے جتنا زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت اور تعلیم کا فیض اٹھایا وہ اتنے ہی زیادہ معیاری مسلمان سمجھے گئے، اور ان کے مقابلہ میں کبھی ان لوگوں کو باعتبار علم یا باعتبار عمل، ترجیح نہیں دی گئی جنہوں نے آنحضرت سے تعلیم اور صحبت کا فیض نہ اٹھایا تھا۔ بلاشبہ مسلمان دونوں تھے۔ مگر دونوں کے مراتب کا فرق کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔